POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 10-11 May 2024, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 85واں سال

Date of Publication: 09-05-2024 • Price: 5/- • 15-21 May 2024 • Issue: 19 • Vol:83

۱۵تا۲۱ مئی ۲۰۲۴ء • شمارہ ۱۹ • جلد ۸۳

# ملک زادہ منظور احمد

## ایک بے ریا شخصیت

**شعیب نظام**

بی اے پاس کرنے کے بعد والدہ کی خواہش کے مطابق میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ میری والدہ کی خواہش تھی کہ میں وکالت پڑھ کر بارہ بنکی یا تحصیل میں وکالت کروں جس سے اراضی کی دیکھ بھال بھی آسانی سے ممکن ہوسکے۔ میرے کلاس جب ختم ہوجاتے تھے تو میں پرویز علوی جو شمسی مینائی صاحب کے بڑے صاحبزادے تھے اور اردو میں ایم اے کر رہے تھے، ان کو لینے شعبۂ اردو کے باہر ان کا انتظار کرتا تھا۔ ان کا آخری پیریڈ ملک زادہ صاحب لیتے تھے۔ ملک زادہ صاحب کی پرکشش آواز مجھے بار بار اپنی طرف کھینچتی تھی۔ میں نے پرویز سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ آپ پہلے اردو میں ایم اے کرلیجیے اس کے بعد ایل ایل بی کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ میں نے والدہ سے مشورہ کیا تو انھوں نے شاید میرا دل رکھنے کے لیے اپنی رضامندی دے دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ یونیورسٹی میں نیتا گیری اپنے عروج پر تھی۔ بارہ بنکی کے ایک معروف یونین لیڈر سے میں نے اپنا مسئلہ بتایا تو انھوں نے کہا کہ چلیے آپ کی فیس ایل ایل بی سے ایم اے (اردو) میں ٹرانسفر کرا دیتے ہیں اور واقعی ایک دو دن کی دوڑ بھاگ میں میرا فارم اور فیس اردو ڈپارٹمنٹ منتقل ہو گئی۔ اس طرح میں نے ایم اے (اردو) جوائن کرلیا۔

ملک زادہ صاحب کے بڑے صاحبزادے جاوید ملک زادہ میرے کلاس فیلو تھے۔ بہت جلد ان سے دوستی ہوگئی اور وکٹوریہ اسٹریٹ واقع حسینین مارکیٹ میں ملک زادہ صاحب کے گھر پر آنا جانا ہونے لگا۔ میں اور جاوید دونوں شاعری کرتے تھے اور وہ مکان شاعروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ہم لوگ نشستوں میں شریک ہونے لگے۔ کبھی کبھی دیر ہو جانے پر ملک زادہ صاحب کے گھر پر ہی رات رک جاتا تھا۔ ملک زادہ صاحب بہت شفقت سے پیش آتے تھے اور لکھنے پڑھنے کا کوئی کام جو وہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے نہیں کر پاتے تھے وہ میرے سپرد کر دیتے تھے اور کام پورا ہوجانے پر عام طور پر بریانی وغیرہ منگا کر اپنے طور پر شاباشی دیتے تھے۔

کلاس میں ملک زادہ صاحب بہت کم آتے تھے جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ ملک بھر کے مشاعروں میں زیادہ مصروف رہتے تھے۔ اس زمانے میں ملک میں جتنے بھی مشہور مشاعرے منعقد ہوتے تھے زیادہ تر کی نظامت ملک زادہ صاحب ہی کرتے تھے مگر جس دن وہ کلاس میں آتے تو وقت کا کوئی تعین نہیں ہوتا تھا۔ جوش ملیح آبادی پر ملک زادہ صاحب دو-دو دن تک کئی کئی گھنٹے اپنا لیکچر دیتے رہتے تھے جو بہت مدلل اور متاثر کن ہوتا تھا اور کبھی کبھی یہ صورت بھی ہو جاتی تھی کہ وہ ایک دن میں ہی کئی شاعروں پر لیکچر دے کر گویا ان شاعروں کو بھی نپٹا دیتے تھے۔ ملک زادہ صاحب کا رویہ اپنے طالب علموں سے تقریباً دوستانہ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں مجھے سگریٹ سے کافی رغبت تھی یہ بات ملک زادہ صاحب کے علم میں بھی تھی وہ اور پروفیسر شبیہ الحسن صاحب سگریٹ پیتے ہوئے کلاس لیتے تھے۔ ملک زادہ صاحب کے پاس جب کبھی سگریٹ ختم ہو جاتی تو وہ مجھ سے استفسار کر لیتے کہ کیا میرے پاس سگریٹ موجود ہے، ایسی صورت میں زیادہ تر میں ان کی خدمت میں سگریٹ پیش کر دیتا اور سگریٹ سلگانے کے بعد ان کا لیکچر جاری رہتا۔ نسیم نکہت بھی میری کلاس فیلو تھیں اور ملک زادہ صاحب کے ساتھ مشاعرے پڑھنے کی وجہ سے وہ ان سے خاصی بے تکلف بھی تھیں۔ ایک دن کلاس میں ان کی کسی بے تکلفی پر ملک زادہ صاحب نے فرمایا کہ نسیم مشاعروں میں آپ ایک شاعرہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور کلاس میں فقط ایک طالب علم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ اس کے بعد نسیم نکہت واقعی ایک طالب علم میں تبدیل ہو گئیں۔

ایم اے کے دوسرے سال میں شارق قدوائی، محسن خان اور ندیم اشرف جائسی بھی اردو ڈپارٹمنٹ آ گئے۔ شعبے کا ماحول ہی ایسا تھا کہ بہت جلد ان نو آوردگان سے دوستی ہو گئی۔ کبھی کبھی کمبائنڈ کلاس بھی ہوتی تھیں خصوصاً ملک زادہ صاحب کمبائنڈ کلاس زیادہ لیتے تھے کیوں کہ انھیں مشاعروں کی وجہ سے پابندی سے کلاس لینے کی فرصت نہیں ملتی تھی اس لیے وہ چاہتے تھے کہ جتنا بھی وقت مل سکے وہ اپنے طالب علموں کو دے سکیں۔

ملک زادہ منظور صاحب اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی اور تاریخ میں بھی ماسٹرز کی ڈگری حاصل کر چکے تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی آنے سے پہلے شبلی کالج میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے پڑھا بھی چکے تھے مگر میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ ملک زادہ صاحب کی شخصیت تصنع اور جھوٹے دکھاوے سے پوری طرح پاک تھی۔ انھوں نے ایک دن کلاس میں دریافت کیا کہ کیا آپ حسن نعیم سے واقف ہیں؟ شافع اور میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ملک زادہ صاحب نے ہنستے ہوئے بتایا کہ پچھلے مشاعرے میں وہ شریک تھے مگر میں اتفاق سے ان سے واقف نہیں تھا اس لیے میں نے صرف ان کے نام کا اعلان کر کے انھیں ڈائس پر مدعو کر لیا۔ کلام پڑھنے کے بعد وہ میرے پاس آئے اور وقت ملتے پر مجھ سے پوچھا کہ جناب آپ کیا کرتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ریڈر ہوں۔ حسن نعیم بولے کہ جناب آپ کو تو پروفیسر ہونا چاہیے۔ ملک زادہ صاحب نے سادگی سے جواب دیا کہ صدر شعبہ شبیہ الحسن صاحب ہیں ان کے سبکدوش ہونے کے بعد پوسٹ خالی ہوگی۔ حسن نعیم نے جواب دیا کہ جناب آپ کی شفقت تو پروفیسروں والی ہے۔ تب ملک زادہ صاحب کی سمجھ میں ان کا طنز آیا۔ کلاس میں یہ واقعہ سنانا ملک زادہ صاحب کے بڑے انسان ہونے کی دلیل ہے وہ خود پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتے تھے جواب تقریباً نایاب ہو گیا ہے۔ میں نے یہ حوصلہ کسی دوسرے پروفیسر میں کبھی نہیں دیکھا۔

ایک دوسرا واقعہ بھی اسی قبیل کا مجھے یاد آ رہا ہے۔ ہم لوگوں نے صلاح الدین پرویز کے اعزاز میں پریس کلب میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا تھا جس میں شرکت کے لیے ڈاکٹر صاحب سے بھی گزارش کی گئی تھی۔ میں جب کلاس سے نکلا تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے روک کر دریافت کیا کہ آپ پروگرام میں کس طرح جائیں گے۔ میں نے جواب دیا ڈاکٹر صاحب میں سائیکل سے پہنچ جاؤں گا۔ انھوں نے حکم دیا کہ آپ میرے ساتھ رکشے پر چلیے گا۔ راستے میں گومتی کے پل پر انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ یہ صلاح الدین پرویز کیا کرتے ہیں۔ پہلے تو میں سوال کی نوعیت ہی نہیں سمجھ پایا اس لیے میں ان کے کاروبار کے

بارے میں بتانے لگا مگر جب ملک زادہ صاحب نے سوال واضح کیا تو میں نے عرض کیا کہ صلاح الدین پرویز نظم کے بہت اچھے شاعر ہیں اور ان کے دو ناول بھی منظر عام پر آچکے ہیں مگر ناولوں کے بارے میں تنازع (Controversy) ہے کہ یہ ناول ان کے لکھے ہوئے ہیں یا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب بولے بس بس میں سمجھ گیا اور پروگرام میں ملک زادہ صاحب نے اپنی تقریر میں سارا زور متنازع شخصیت پر دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ بڑی شخصیتیں عام طور پر متنازعہ ہوتی ہیں۔ اس لیے صلاح الدین پرویز کے بڑے فنکار ہونے میں مجھے کوئی کلام نہیں ہے اور سب سے زیادہ تالیاں ملک زادہ صاحب کی تقریر پر ہی بجیں۔

ملک زادہ صاحب کے گھر جب شام کو میں حاضر ہوتا تو مجھے کبھی کبھی وہ کہتے کہ چلو امین آباد چلتے ہیں، تھوڑی دیر لبیب کدہ میں بیٹھیں گے۔ لبیب کدہ سے ان کی مراد والی آسی بھائی کا مکتبہ دین و ادب ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس ایک لمبریٹا اسکوٹر تھی۔ والی بھائی کے مکتبے پر وہ ایک شاعروں کا آنا جانا برابر لگا رہتا تھا۔

ان دنوں وہاں عرفان صدیقی، ناظم ملیح آبادی، انور ندیم اور باہر سے کسی مشاعرہ سے آنے والے دو ایک شاعر یا کسی مشاعرہ میں جانے والے شاعر بھی موجود ہوتے تھے۔ ملک زادہ صاحب اکثر ایک مصرعہ پڑھتے اور والی صاحب سے دوسرا مصرعہ لگانے کی فرمائش کرتے۔ اگلے شعر کے لیے (وہ عرفان صاحب سے بھی جن سے ان کے دوستانہ مراسم تھے) عرفان صاحب سے فرمائش کرتے اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد تقریباً پانچ شعر پورے ہو جاتے۔ ملک زادہ صاحب خود بہت اچھے شاعر تھے مگر یونیورسٹی کی ملازمت، پورے ملک میں مشاعروں کے لیے سفر اور دو دو گھروں کی ذمے داریاں انھیں وقت ہی نہیں دیتی تھیں کہ وہ سنجیدگی سے شاعری یا ادب کی طرف رجوع کر سکیں۔

ابوالکلام آزاد پر ڈاکٹر صاحب نے پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھا تھا جو کتابی شکل میں موجود ہے۔ اسے پڑھ کر آسانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب بہت عمدہ نثر لکھنے پر قادر تھے اور اپنی بات خاصے مدلل انداز میں کہنے کی ان میں بڑی صلاحیت تھی مگر ملک بھر میں مشاعرے انھیں ایک کونے سے دوسرے کونے تک کھینچتے رہتے تھے اور یہ بھی سچ ہے کہ جب ملک زادہ صاحب نے مشاعروں میں نظامت کی ابتدا کی تھی وہ ان کی نوجوانی کا عالم تھا۔ اس وقت مشاعروں میں جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، مجاز لکھنوی، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری اور فراق گورکھپوری جیسے شعرا شریک ہوتے تھے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ مشاعرے ہماری تہذیب اور ادب کی پرورش کرتے تھے۔ ایک زمانے تک پورے ملک میں اس معیار کے شاعر مشاعروں میں موجود ہوتے تھے اور ان کے مرتبے کے اعتبار سے ناظم کا سخت امتحان ہوتا تھا کہ کس کو کہاں پڑھایا جائے جس سے اس کی دل شکنی بھی نہ ہو اور سامعین پورے مشاعرے سے لطف اندوز بھی ہو سکیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک زمانے تک اس سخت امتحان سے بہت ثابت قدمی کے ساتھ گزرے۔ اس زمانے میں سامعین کا معیار بھی خاصا بلند ہوتا تھا اور اچھے شعروں پر بھرپور داد ملتی تھی اور سامعین کی طرف سے جو جملے بھی اچھالے جاتے تھے ان میں بھی عامیانہ پن یا گھٹیا پن نہیں ہوتا تھا۔ ملک زادہ صاحب بتاتے تھے کہ جگر مرادآبادی صاحب جب اپنی غزلیں سناتے تھے تو سامعین پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ مجاز لکھنوی اپنے عہد کے سب سے مقبول شاعر تھے اور ان سے تقریباً ہر مشاعرے میں ان کی مشہور نظم "آوارہ" کی فرمائش کی جاتی تھی۔ اپنے آخری مشاعرے میں مجاز نے اپنی غزلیں پیش کیں اور جب سامعین "آوارہ" کی زیادہ فرمائش کرنے لگے تو مجاز نے یہ جملہ کہہ کر مائک چھوڑ دیا کہ بھائی اب وہ بہت زیادہ آوارہ ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بتاتے تھے کہ جوش ملیح آبادی اپنی نظم [illegible] ایک خاص وجد کی کیفیت میں سناتے تھے اور نظم کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ان کے دائیں ہاتھ کی بھی حرکت کرتی رہتی تھی۔ بقول ڈاکٹر صاحب جوش کی ایک اور نظم "کل بدلی کل بدلی ہے" بھی مشاعروں میں بہت مقبول ہوتی تھی اور اس نظم کو بھی جوش ایک والہانہ انداز سے ہی پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب جب ماضی کے ان مشاعروں کا ذکر کر رہے ہوتے تھے تو ان کی آنکھیں چھلکنے لگتی تھیں اور ہم لوگ مبہوت ہو کر گویا ان مشاعروں کے سامعین میں تبدیل ہو جاتے تھے مگر دھیرے دھیرے مشاعروں سے یہ بڑے لوگ اٹھتے چلے گئے اور اس کے ساتھ ساتھ مشاعروں کی وہ ادبی فضا بھی گرتی چلی گئی جو عین فطری بھی تھی مگر ملک زادہ صاحب نے مشاعروں کی نظامت میں کبھی لطیفہ گوئی یا عامیانہ پن سے کام نہیں لیا۔ خاصے دن پہلے انھوں نے اپنے شاگرد انور جلال پوری سے ایک آدھ مشاعروں میں ساتھ بیٹھ کر نظامت کروائی۔ بتدریج وہ بھی مشاعروں کی نظامت کرنے لگے تھے۔ ایک دن میری موجودگی میں ملک زادہ صاحب نے انور جلال پوری صاحب سے کہا تھا کہ بشیر بدر اچھے شاعر ہیں جب کہ تم اچھے ناظم ہو سکتے ہو اس لیے ساری توجہ مشاعروں کی نظامت پر لگاؤ اور وقت نے دیکھا کہ ملک زادہ کی موجودگی میں ہی انور جلال پوری صاحب نے مشاعروں کی نظامت میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا مگر یہاں پر مجھے انور جلال پوری کے حوالے سے ایک شعر یاد آ رہا ہے:

تجھ کو اتنا کچھ بنانے میں مرا بھی ہاتھ ہے
میری جانب دیکھ میں بھی تیرے پس منظر میں ہوں

انور جلال پوری کو نظامت میں لانے اور انھیں مستحکم کرنے میں ملک زادہ صاحب کا بنیادی کردار تھا۔ وہ اپنے شاگردوں سے واقعی محبت کرتے تھے۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ نشور واحدی صاحب کا ٹی وی کے لیے انٹرویو کرنا ہے مگر نشور صاحب کا اصرار ہے کہ میں ان سے پہلے مل لوں، تم بھی چلو۔ نشور صاحب مسلم مسافر خانے واقع چارباغ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ بارش کا موسم تھا، چارباغ سے مسلم مسافر خانے تک جانے والی روڈ بہت خراب اور پھسلن بھری تھی بہرحال ہم لوگ پہنچ گئے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میری فرمائش پر نشور صاحب نے اپنے مخصوص ترنم میں دو غزلیں سنائیں۔ تھوڑی دیر بعد ملک زادہ صاحب نے دریافت کیا کہ آپ نے بلایا تھا کہ ریکارڈنگ سے پہلے مجھ سے مل لیجیے۔ فرمائیے میرے لائق کوئی خدمت؟ نشور صاحب نے فرمایا آپ مجھ سے اقبال کی تصورِ خودی پر ضرور سوال کیجیے گا۔ ڈاکٹر صاحب کچھ سمجھ نہیں پائے انھوں نے کہا کہ آپ مطمئن رہیے میں آپ کی شاعری کے حوالے سے سوالات کر لوں گا۔ مگر نشور صاحب اپنے سوال پر قائم رہے۔ ڈاکٹر صاحب کے استفسار پر نشور صاحب بولے میں نے اقبال کے فلسفۂ خودی کو رد کر دیا ہے، کیا میری کتاب آپ کی نظر سے نہیں گزری۔ اب حیران ہونے کی باری ہماری اور ڈاکٹر صاحب کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب لاکھ سمجھاتے رہے کہ نشور صاحب آپ کی شاعری میں اور بھی بہت کچھ ہے میں گفتگو کروں گا مگر نشور صاحب تقریباً ضد پر اڑے ہوئے تھے کہ صاحب یہ سوال بہت ضروری ہے۔ بہرحال ہم لوگ باہر آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب دیر تک ہنستے رہے۔ پتا نہیں ریکارڈنگ میں ڈاکٹر صاحب نے یہ سوال پوچھا یا نہیں مگر مجھے یاس یگانہ چنگیزی بہت یاد آئے۔

ملک زادہ صاحب اور شمس الرحمٰن فاروقی ایک زمانے میں شبلی کالج میں انگریزی کے استاد رہ چکے تھے، اس لیے دونوں ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف بھی تھے۔ "شب خون" میں فاروقی صاحب نے جرأت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک طویل نظم لکھی۔ جرأت نے اپنی مثنوی میں جانوروں کا ذکر کیا تھا اور شاید ہی کوئی جانور ان کی مثنوی سے باہر رہ سکا ہو۔ فاروقی صاحب نے اپنی نظم میں پرندوں کا ذکر کیا تھا اور فاروقی کی بھی یہ کوشش تھی کہ کوئی بھی پرندہ نظم سے باہر نہ رہ جائے۔ نظم میں ایسے مشکل الفاظ استعمال ہوئے تھے کہ جب میں نے ملک زادہ صاحب کو وہ نظم پڑھوائی تو وہ دیر تک ہنستے رہے اور بولے کہ اس نظم کو کچھ قرأت آئی ڈی کے پروفیسر بھی آسانی سے نہیں پڑھ سکتے۔ نظم کی تعریف میں انھوں نے فاروقی صاحب کو ایک خط بھی لکھا تھا جس کا بہت محبت بھرا جواب فاروقی صاحب کی طرف سے آیا۔ فاروقی صاحب نے لکھا تھا کہ میں خود آپ کا مداح رہ چکا ہوں ملک زادہ صاحب۔ فاروقی صاحب کے خط سے بہت خوش ہوئے تھے۔

مگر اس کے برعکس ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے کہ نیشنل ویمن لکھنؤ نے ایک مشاعرے کا انعقاد کیا تھا جس کی نظامت ملک زادہ صاحب کر رہے تھے۔ فاروقی صاحب اور عرفان صدیقی صاحب پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے اور مشاعرے کے دوران یہ دونوں حضرات کسی شعر یا کسی موضوع پر گفتگو بھی کرتے جاتے تھے۔ مشاعرہ ریکارڈ ہونے کے بعد ملک زادہ صاحب نے بھری محفل میں فاروقی صاحب سے خاصے سخت لہجے میں اپنی ناراضگی درج کرائی۔ ملک زادہ صاحب جب اپنی بھڑاس نکال چکے تو فاروقی صاحب صرف اتنا کہتے رہے کہ چلو ہو گیا ملک زادہ صاحب اور یہ بات ختم ہو گئی۔ فاروقی صاحب نے ایک طرح سے اس واقعے کو تماشا نہیں بننے دیا۔ کئی دن بعد جب میں نے اس واقعے کا ذکر کیا تو ملک زادہ صاحب نے صرف اتنا کہا کہ کبھی کبھی ہو جاتا ہے بھائی۔ میں نے محسوس کیا کہ بعد میں ملک زادہ صاحب کو بھی اپنا رویہ کچھ زیادہ سخت معلوم ہوا ہوگا اور انھیں اپنے ایک اچھے دوست کے ساتھ اس طرح کا واقعہ پیش آنے پر افسوس ضرور تھا۔

شعبے میں شبیہ الحسن صاحب کے رویے سے کبھی کبھی ملک زادہ صاحب برہم ہو جاتے تھے۔ ایک بار شبیہ الحسن صاحب کا بیان رخصت پر تھے، ملک زادہ صاحب نے ہم لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ پتلون شرٹ پہننے والا کوئی بھی شخص تب تک صدر شعبہ نہیں بن سکتا جب تک شیروانی پہننے والے شخص سے جیت نہیں سکتا۔ ظاہر ہے یہاں شیروانی پہننے والے شخص سے مراد صدر شعبہ شبیہ الحسن صاحب ہی تھے۔ انھوں نے غصے میں میز پر رکھا ہوا قلم ان دیوار پر پھینک دیا اور اٹھ کر شعبے سے باہر چلے گئے۔ میں نے اپنی پوری طالب علمی کے زمانے میں ملک زادہ صاحب کو پہلی بار غصے میں دیکھا تھا ورنہ عام طور پر ان کی خوش مزاجی ہمیشہ قائم رہتی تھی جو ان کی شخصیت کا ایک لازمی جزو تھا۔

مشاعروں میں دھیرے دھیرے اس حد تک زوال آ گیا تھا کہ طے شدہ رقم کو بڑھانے پر اچھے اچھے شعرا کو بیزار سے بحث کرتے نظر آتے تھے اور دلیل دیتے تھے کہ تین اہم شاعر آپ کے مشاعرے میں نہیں آئے اس لیے میری طے شدہ رقم میں اضافہ کر دیا جائے۔ اس طرح کے ایک واقعے کا ذکر بے موقع نہ ہوگا۔ اطہر نبی صاحب میری طالب علمی کے زمانے میں بہت بڑے بڑے مشاعرے منعقد کرتے تھے اسی طرح کا ایک پروگرام گومتی کے کنارے منعقد کیا گیا تھا جو ہر لحاظ سے بہت کامیاب مشاعرہ تھا۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد اطہر نبی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ شعیب تم کس طرح جاؤ گے۔ میں نے جواب دیا دوستوں کے ساتھ نکل جاؤں گا۔ اطہر صاحب نے اصرار کیا کہ میں امین آباد چل رہا ہوں آپ میری گاڑی میں بیٹھ جائیے۔ ابھی گاڑی اسٹارٹ نہیں کی تھی کہ شمیم جے پوری صاحب گاڑی کے قریب آ گئے اور اطہر صاحب سے طے شدہ رقم سے ایک ہزار روپے زیادہ دینے کی فرمائش کرنے لگے۔ اطہر نبی نے انھیں جواب دیا کہ شمیم صاحب آپ نے خط میں جتنی رقم کا مطالبہ کیا تھا وہ آپ کو پیش کی جا چکی ہے مگر شمیم صاحب حوالہ دینے لگے کہ دو شاعر نہیں آئے ہیں اور میں نے آپ کے مشاعرے کے لیے ایک دوسرا مشاعرہ چھوڑ دیا ہے، اس لیے مجھے ایک ہزار روپے مزید دے دیں تو مناسب رہے گا۔ اطہر صاحب تھوڑی دیر تک ان کو سمجھاتے رہے اور پھر غصے میں انھوں نے سو سو کے دس نوٹ زمین پر پھینک دیے اور شمیم جے پوری سے بولے کہ فوراً اٹھائیے اور پچھلی گاڑی میں

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

# شہرِ سخن کے سلطان: حضرتِ حشم الرمضان

**عظیم انصاری**

انسانی زندگی میں شاعری کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ صرف جمالیاتی اور تاثراتی خصوصیات کی حامل نہیں ہے بلکہ اس کا رشتہ زندگی کے ساتھ اس لیے مستحکم ہوا ہے کہ سماجی ارتقا میں اس کا بھی اہم رول رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ یونیسکو کے زیرِ اہتمام 21 مارچ کو ہر سال شاعری کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد شاعروں اور شاعری کی پذیرائی کرنا اور اس کی ترویج کرنا ہے۔ یونیسکو کو بھی احساس ہے کہ قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ معروف شاعر و ادیب نصر اللہ نصر کا کہنا ہے:

> "قلم نے بڑے بڑے دشمنوں کے چھکے چھڑا دیے ہیں۔ جنگیں فتح کی ہیں۔ قلم نے ایسے نعرے دیے ہیں جو دشمن کے دلوں کو دہلانے کے لیے کافی ہیں۔ مگر ذہنی بلاغت اور بلند شعور نہ ہو تو فنکار کے ہاتھ میں ایک کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ نہ اس میں شدت آسکتی ہے نہ تیغ کی دھار۔"

جس سماج میں شاعر کا احترام ہوتا ہے وہاں ادب اور سماج کا رشتہ زیادہ مستحکم نظر آتا ہے۔ بنگال کے شعری و ادبی منظرنامے پر ایک ایسی ہی شخصیت کا نام ہے حشم الرمضان جنھیں ہم بلا شبہ شہرِ سخن کا سلطان کہہ سکتے ہیں۔

حشم الرمضان ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ ایک اچھے ناقد بھی تھے۔ اردو، فارسی اور انگریزی زبان پر عبور ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری یا نثر نگاری میں ایک بیدار ذہن نظر آتا ہے۔ جہاں تک ان کی شاعرانہ صلاحیت کی بات ہے تو اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ وہ اپنے وقت کے ایک ممتاز شاعر تھے اور فنِ شاعری کے تمام رموز و علائم سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔

شاعری انسانی جذبوں کی اچھی ترجمان ہے بلکہ عکاسِ فطرت بھی ہے۔ لیکن جذبوں کی صحیح ترجمانی کے لیے اس کو لطیف ہونا بہت ضروری ہے۔ ادب کا شائق اچھی طرح جانتا ہے کہ شاعری کی بنیاد احساسِ جمال اور تاثر پر ہے۔ اس لیے ہر شاعر زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ اپنے آپ کو اس کا ہم نوا بنا لیتا ہے اور اپنے لب و لہجے میں اسی انداز میں تبدیلی لاتا ہے تاکہ اس کی آواز عوام الناس تک پہنچ جائے۔ یہ جوہر حشم الرمضان کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کی شاعری میں نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہیں لیکن وہ اپنی پُراثر نظموں کی وجہ سے زیادہ مقبول ہیں۔ معتبر اور معروف شاعر علقمہ شبلی کا کہنا ہے:

> "حشم الرمضان نظم کے شاعر ہیں۔ نظم جس تنظیمِ خیال اور مرکزیت کی متقاضی ہے انھیں اس کا احساس ہے۔ بیشتر نظموں میں انھوں نے اس کا لحاظ رکھا ہے۔ فارسی سے شغف ہونے کی وجہ سے الفاظ و تراکیب کا انتخاب بھی معنی خیز اور دل پذیر ہے۔"

نصر اللہ نصر اپنی کتاب 'بنگال میں اردو نظم نگاری' میں حشم الرمضان کے متعلق لکھتے ہیں:

> "فنِ نظم گوئی میں مہارت رکھتے تھے۔ سماج اور معاشرے کی منظرکشی میں کمال رکھتے تھے۔ وہ معاشرے کے مزاج داں بھی تھے۔ وہ حسن و جمالیات کے گرویدہ تھے۔ ان کی نظموں میں نشاط انگیز لمحات اور کیفیات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ عورتوں کی بے بسی اور کرب انگیز زندگی کا محاسبہ ان کی نظموں میں جابجا ملتا ہے۔ 'طوائف' اور 'طوائف کی بیٹی' ان کی شاہکار نظمیں ہیں۔ ان کی دیگر نظموں میں نہرو، اندرا گاندھی، ذوالفقار علی بھٹو کی ذاتِ گرامی کے علاوہ "مردز وہ چیونٹیوں کے پنجے، ترانۂ امن، برابر کے شریک، اور دیپ جلے دیوالی شامل ہیں۔"

حشم الرمضان نے جب شاعری شروع کی، اُس وقت ادبی منظرنامے پر جوش ملیح آبادی، مجاز، جذبی اور جاں نثار اختر چھائے ہوئے تھے، لہٰذا یہ بھی اسی ڈگر پر چل پڑے۔ اس سلسلے میں ان کی علمی و لسانی صلاحیت نے مزید تقویت بخشی۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس دور میں اکثر شاعروں کے مجموعے دو حصوں میں منقسم دکھائی دیتے ہیں۔ پہلے حصے میں روایتی اور عشقیہ نظمیں ہیں یا پھر منظر نگاری ہے اور دوسرے حصے میں سماجی موضوعات اور انقلابی تصورات پر مشتمل منظومات شامل ہیں۔ 'میری نظمیں میرے گیت' میں جہاں روایتی اور عشقیہ نظمیں 'شاہکار'، 'دو ورق' اور 'نو عروس' جیسی نظمیں ہیں وہیں سماجی موضوعات پر مبنی نظمیں 'بیڈی گرل'، 'طوائف'، 'طوائف کی بیٹی' اور 'بانجھ' جیسی اہم نظمیں ہیں جو اس بات کی غماز ہیں کہ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ بقول عشرت ظفر:

> "حشم الرمضان ایک دردمند انسان ہیں۔ ان کی تخلیقات عظیم و بسیط آئینہ ہیں جو اپنے گرد و پیش کے تمام مناظر کھینچتی ہیں لیکن یہ آئینہ تمام تصویروں کو محفوظ رکھتا ہے گویا آئینہ نہیں بلکہ ایک طرح کا محافظ خانہ ہے جہاں تمام عکس و تصویریں بے حد تحفظ کا احساس کرتی ہیں۔"

حشم الرمضان اقبال و غالب سے حد درجہ متاثر تھے لہٰذا ان دو عظیم شعرا پر ان کی شاندار نظمیں ہیں۔ انھوں نے حالاتِ حاضرہ سے متاثر ہو کر نہرو، اندرا گاندھی اور بھٹو جیسی شخصیات پر کامیاب نظمیں کہی ہیں۔ پابند نظم کہنے والے شاعر خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آج کے شاعر سہل پسند ہو گئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ زیادہ تر فارسی زبان سے ناواقف ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آج کی نسل اردو زبان کے نشیب و فراز سے واقف نہیں ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی کہ حشم الرمضان پابند نظموں کے ایک صاحبِ طرز شاعر تھے اور اپنے ہم عصر شاعروں میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔

آیئے اب ذرا ان کی غزل گوئی پر نظر ڈالیں۔ نظم کی طرح حشم الرمضان کی غزلیہ شاعری میں فکر و فن کی گہرائیاں ہیں جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں روایت کی پاسداری کی ہے لیکن ان میں اسلوب کی چاشنی ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کی غزلیہ شاعری کا لب و آہنگ بدلا ہے جس کا اثر انھوں نے بھی قبول کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں روایت کی پاسداری بھی ہے اور عصرِ حاضر کا درد بھی۔ غزل کا مزاج جن باتوں کا متقاضی ہے وہ اس کا پورا دھیان رکھتے تھے بقول معروف شاعر و ادیب ایم علی (مرحوم):

> "حسن و عشق کی باتیں، حکایتِ دل، شیخ و برہمن کی تکرار، دیر و حرم کا تضاد، وفا و جفا کے میلانات، رند و رقیب کا التزام، تصوف کا رنگ اور ایسے ہی دوسرے روایتی افکار حشم صاحب کی غزلوں کی آماجگاہ ہیں۔"

لیکن ان کے یہاں روایتی اشعار بھی کافی دلکش ہیں۔ وہ غزل کی نازکی، لطافت اور رموز و نکات سے کس قدر واقف ہیں مندرجہ ذیل اشعار پڑھ کر اندازہ ہو جائے گا:

غم کی لذت سے وہ کہاں واقف
جس کو آزارِ عشق یار نہ ہو

مستی بھری فضائیں، بادل یہ کالے کالے
ایسے میں دل مچل کر توبہ نہ توڑ ڈالے

پرششِ حال وہ جو کر جائے
نبض ڈوبی ہوئی ابھر جائے

کوئی دیکھے تو سہی ان کی کرم فرمائی
کاٹ کر میرے پر، وہ پال رہا کرتے ہیں

بندہ پرور کم سے کم سائل ہی مجھ کو جان کر
گاہے گاہے حسن کے صدقے اتارا کیجیے

داغِ دل زینتِ دل ہے تجھے احساس بھی ہے؟
حسن چہرے کا بڑھا دیتا ہے اک تل تنہا

اللہ رے ترے عارض، اللہ ترے گیسو
اک صبح درخشاں سی، اک شام سہانی سی

عرضِ تمنا پہ میری ان ہونٹوں پہ مسکان تو ہے
چاہے لاکھ نہ برسے بادل، بارش کا امکان تو ہے

مندرجہ بالا اشعار میں کیا غضب کی سادگی و برجستگی ہے۔ تراکیب میں بھی حسن ہے جو ہمارے دل کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ شاعری کے لیے حسِ لطیف کا ہونا ضروری ہے اور یہ خوبی شہرِ سخن کے اس سلطان کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ہر شاعر اپنے دور سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا اثر اس کی شاعری میں ضرور جھلکتا ہے۔ یہ بھی اپنے اردگرد کے حالات سے بے تعلق نہیں تھے۔ لہٰذا ان کی شاعری میں عصری حسیت نمایاں ہے۔ اپنی بات کی دلیل میں مندرجہ ذیل اشعار پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ کریں:

ہم تک نہ آسکی جب بھولے سے اک کرن بھی
کیا صبح تو وعدہ کس کام کے اجالے

بیٹھ کر کبھی جب اٹھنے لگے ہم
ریزہ ریزہ ہر اک سنگ تھا ہوا

(بقیہ صفحہ 5 پر)

# اردو دُنیا

## اساتذہ کی اسامیوں پر تقرری کا مطالبہ

سنگاریڈی (19 مئی)۔ سنگاریڈی میں سید صابر علی (صدر ایس ٹی یو ٹی ایس) کی صدارت میں یونین کا اجلاس منعقد ہوا جس میں سرجواس، انعموز (جنرل سکریٹری) اور دیگر اساتذہ نے شرکت کی۔ اس موقع پر سید صابر علی نے ودیا والینٹر کی تقرری اور اساتذہ کے تبادلے عمل میں لانے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ ضلع سنگاریڈی میں ایک ہزار اساتذہ کی اسامیاں خالی ہیں جنھیں جلد سے جلد پُر کرتے ہوئے طلبہ کی تعلیم پر توجہ دی جائے۔ نیز یونیفارم اور نوٹ بکس فراہم کرنے کے لیے اقدام کرنے کا بھی حکومت سے مطالبہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ اسکولوں میں صفائی ملازمین کی بھی ضرورت ہے جن کی تقرری فوری طور پر عمل میں لائی جائے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

## میڈیکل کالج نارائن پیٹ کے سائن بورڈ پر اردو ندارد

نارائن پیٹ (20 مئی)۔ حکومت تلنگانہ کی جانب سے نارائن پیٹ ضلع مستقر میں گورنمنٹ میڈیکل کالج کی پُرشکوہ عمارت کا کام تقریباً مکمل ہو گیا ہے۔ اور اس سال سے داخلوں کا آغاز عمل میں آنے والا ہے لیکن افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ گورنمنٹ میڈیکل کالج پر صرف انگریزی اور تلگو میں سائن بورڈ پر تحریر کیے گئے ہیں اور اردو کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ حالاں کہ اردو ریاست کی دوسری سرکاری زبان ہے اور ضلع نارائن پیٹ اردو بولنے اور پڑھنے والوں کی بڑی آبادی والا علاقہ مانا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ضلع کے محبانِ اردو اور اردو داں طبقے میں بے چینی پائی جا رہی ہے۔ مسلم سیاسی قائدین و ہمدردانِ اردو اس سلسلے میں فوری حرکت میں آتے ہوئے ارباب مجاز بالخصوص ارکان اسمبلی نارائن پیٹ، مکتھل و کوڑنگل سے نمائندگی کرتے ہوئے گورنمنٹ میڈیکل کالج نارائن پیٹ کے سائن بورڈ پر اردو تحریر کو یقینی بنانے کے لیے اقدام کریں۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

## شبر امام نے بہار کے اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا

اردو کونسل ہند کا مشہور فکشن نگار و ادیب شبر امام کی رحلت پر اظہار افسوس

پٹنہ (18 مئی)۔ بہار کے مشہور فکشن نگار و ادیب شبر امام کی رحلت پر اردو کونسل ہند نے اظہار تعزیت کیا اور کہا کہ انھوں نے بہار کے اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ کونسل کے صدر اور سابق وزیر بہار شکیل نبی نے کہا کہ شبر امام بہار کے ایک مشہور و معروف ناول نگار، ادیب اور صحافی تھے جن کی خدمات پانچ دہائیوں پر مشتمل ہیں۔ اردو کونسل ہند کے ناظم اعلیٰ اسلم جاوداں نے کہا کہ شبر امام کی خدمات ادب گراں قدر اور ناقابل فراموش ہیں۔ ناول نگاری اور صحافت کے علاوہ انھوں نے ذہنیات اور ادبیات پر بھی بہت سارے تحقیقی کام کیے ہیں۔ اب تک ان کی 28 کتابیں شائع ہو کر مقبول اور مشہور ہو چکی ہیں۔ انھوں نے انگریزی میں 'سید آف دی غازی پور' بھی دو جلدوں میں مرتب کیا۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں لکھنؤ کی میر اکیڈمی سے امتیاز میر اور بہار اردو اکیڈمی سے کئی ایوارڈ مل چکے ہیں۔ حکومت بہار کے اردو ڈائرکٹوریٹ کے ذریعے انھیں خدمات ادب کے لیے فروغ اردو ایوارڈ سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ اسلم جاوداں نے بتایا کہ شبر امام سے ان کے ذاتی قریبی تعلقات تھے۔ انھوں نے اردو ڈائرکٹوریٹ میں آکر انھیں اپنی ایک درجن کتابوں کا تحفہ پیش کیا تھا جس سے ان کی ادبی، علمی اور دانشورانہ صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو کونسل ہند کے ناظم ڈاکٹر نسیم اختر نے کہا کہ شبر امام سے ان کے گھریلو مراسم تھے اور وہ انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ نسیم اختر نے مزید کہا کہ شبر امام نے خدمت ادب کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیا تھا۔ کونسل کے ناظم ڈاکٹر انوار الہدیٰ نے بھی شبر امام کی رحلت پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ ان کی خدمت اردو ادب ناقابل فراموش ہے۔ اس موقع پر اردو کونسل ہند کے ڈاکٹر محبوب عالم، وصی حیدر اور اعجاز حسن نے بھی شبر امام کی موت کو اردو ادب کے خسارے سے تعبیر کیا اور ان کے تئیں اظہار غم کیا ہے۔ بہار پبلک سروس کمیشن کے سابق صدر نشیں اور اردو ڈائرکٹوریٹ کے سابق ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے بھی اپنے تعزیتی بیان میں کہا کہ وہ واقعی بہار کے ایک بلند قامت قلم کار تھے، جنھوں نے اپنے قلم سے بہار کے اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا۔ میں جب اردو ڈائرکٹوریٹ کا ڈائرکٹر تھا تو ادارے کی جانب سے ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کو اعزاز اور ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ اس موقع پر مذکورہ حضرات نے شبر امام کے لیے مغفرت اور ان کے پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی۔

(قومی تنظیم۔ پٹنہ)

## دسویں اور بارہویں کلاس کے نتائج کا اعلان، اردو میڈیم اسکولوں کی کارکردگی تسلی بخش

نئی دہلی (13 مئی)۔ سی بی ایس ای دسویں اور بارہویں جماعت کے نتیجے جاری کر دیے گئے ہیں۔ زیادہ تر اردو میڈیم اسکولوں کے نتائج تسلی بخش رہے۔ وہیں کچھ اردو میڈیم اسکولوں نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے صد فیصد نتائج درج کرائے ہیں۔ ان میں ایس کے وی چوڑی والان، ایس کے وی چشمہ بلڈنگ، بلیماران، ایس کے وی زینت محل لال کنواں کے نام شامل ہیں۔ وہیں سرکار سے امداد یافتہ اسکولوں میں شامل اینگلو عربک سینئر سیکنڈری، فتح پوری مسلم سینئر سیکنڈری، شفیق میموریل سینئر سیکنڈری اور حکیم اجمل خان گرلز سینئر سیکنڈری اسکولوں کے نتائج تسلی بخش رہے۔

ایس کے وی چوڑی والان اسکول کا بارہویں کلاس کا رزلٹ صد فیصد رہا۔ 62 طالبات نے بورڈ امتحان میں شرکت کی۔ 94 فیصد نمبر حاصل کر کے راضیہ نے اول مقام حاصل کیا۔ 84.4 فیصد نمبر لاکر اسماء نے دوسری جب کہ 84.4 فیصد نمبر حاصل کر کے عروبہ نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ دسویں جماعت کا نتیجہ بھی صد فیصد رہا۔ 43 طالبات نے بورڈ امتحان میں شرکت کی تھی۔ سکینہ دہلی نے 83.2 فیصد نمبر کے ساتھ اول پوزیشن حاصل کی۔ علیشا نے 78.2 فیصد نمبر کے ساتھ دوسری جب کہ عرشی نے 73.2 فیصد نمبرات کے ساتھ تیسری پوزیشن حاصل کی۔ ہیڈ آف دی اسکول بینا سنگھ نے طالبات کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس کو طلبہ، اساتذہ اور والدین کی مجموعی محنت کا نتیجہ قرار دیا۔

بلی ماران، بلی ماران میں واقع ایس کے وی چشمہ بلڈنگ اسکول کا بارہویں کلاس کا رزلٹ صد فیصد رہا۔ 52 طالبات نے بورڈ امتحان میں شرکت کی تھی۔ 88 فیصد نمبر حاصل کر کے دعیہ ناز نے پورے اسکول میں اول مقام حاصل کیا۔ 87 فیصد نمبر لاکر حبیبہ نور نے دوسری، جب کہ 85 فیصد نمبر لاکر قریبہ نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ بارہویں جماعت میں طالبات نے مجموعی طور پر 70 ڈسٹنکشن حاصل کیں۔ چشمہ بلڈنگ اسکول کا دسویں جماعت کا رزلٹ بھی صد فیصد رہا۔ شفاء نے 81 فیصد نمبر لاکر اول مقام حاصل کیا۔ ثانیہ مرزا نے 75 فیصد نمبر کے ساتھ دوسری، جب کہ صبا نے 70 فیصد نمبر کے ساتھ تیسری پوزیشن حاصل کی۔

ایس کے وی نمبر 2 زینت محل، لال کنواں کا بارہویں جماعت کا رزلٹ صد فیصد رہا۔ 59 طالبات نے بورڈ امتحان میں شرکت کی تھی۔ 92.8 فیصد کے ساتھ اقرا نے پورے اسکول میں اول مقام حاصل کیا۔ 92.2 فیصد نمبر لاکر ادیبہ نور نے دوسری، جب کہ 91.8 فیصد نمبر کے ساتھ علیزہ و سلیم نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ (انقلاب۔ دہلی)

## اردو میڈیم سے ایم بی اے و ایم کام کورسز میں داخلے

حیدرآباد (14 مئی)۔ ڈاکٹر شرافت حسین Tausch کمپنی کے کو فاؤنڈر اور ڈائرکٹر ہیں۔ انھوں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے مینجمنٹ ڈپارٹمنٹ سے ایم بی اے کا کورس مکمل کیا۔ یو جی سی کا نیٹ امتحان پاس کرنے کے بعد مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے ہی ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کی تعلیم مکمل کی اور آج ڈاکٹر شرافت حسین دہلی میں واقع امریکہ یونیورسٹی میں بطور پروفیسر کارگزار ہیں۔ ڈاکٹر شرافت حسین کے مطابق اردو یونیورسٹی سے اردو میں تعلیم حاصل کر کے ایک امریکی یونیورسٹی میں ملازمت کرتے ہوئے انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اردو میڈیم سے تعلیم کا حصول کسی طرح سے کوئی رکاوٹ نہیں بلکہ اردو طلبہ کو آگے بڑھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شرافت حسین کی طرح مانو سے فارغ بیشتر طلبہ ملک و بیرون ملک اعلیٰ عہدوں پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر عبدالعظیم (صدر شعبۂ مینجمنٹ و کامرس) کے مطابق مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں سال 2004 میں ایم بی اے کا پروگرام پوسٹ گریجویٹ سطح پر شروع کیا گیا اور ابتدا سے ہی یہاں سے فارغ طلبہ کو بڑی آسانی سے ملازمتیں ملتی گئی ہیں۔ ان کے مطابق ایم بی اے کا ذریعۂ تعلیم تو اردو ہی ہے مگر طلبہ کو انگریزی اور پرسنالٹی ڈیولپمنٹ اور دیگر مضامین میں بھی ماہر بنایا جاتا ہے۔ اے آئی سی ٹی ای کا سفارشی نصاب پڑھایا جاتا ہے جس کی وجہ سے مانو کے ایم بی اے پاس طلبہ نے اندرون ملک جاب مارکٹ میں کامیابی کے پرچم لہرائے۔ ساتھ ہی بیرون ممالک میں بھی انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا کر ثابت کیا کہ اردو میڈیم سے تعلیم طالب علم کو آگے بڑھنے میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس شعبے کے تحت چار سالہ بی کام جنرل اور بی کام IIBP بھی چلایا جاتا ہے۔ مانو کے ایم بی اے (پوسٹ گریجویٹ) پروگرام میں داخلے کے لیے طالب علم کو کسی بھی مضمون میں 50 فیصد نشانات سے گریجویشن کامیاب ہونا لازمی ہے۔ اس کورس میں سیٹوں کی کل تعداد 120 ہے۔ داخلہ انٹرنس میں رینک کی بنیاد پر دیے جاتے ہیں۔ داخلہ فارم آن لائن یونیورسٹی کے پورٹل پر داخل کرنا ہوگا۔ درخواستیں داخل کرنے کی آخری تاریخ 20 مئی 2024 ہے۔ کورس کے متعلق مزید تفصیلات اور رہبری کے لیے ان فون نمبرات 9849325765 اور 9849847434 پر رابطہ کریں۔ غیر مقامی طلبہ کو ہاسٹل کی محدود گنجائش ہے۔ شعبۂ کامرس و مینجمنٹ کے تحت پوسٹ گریجویشن کی سطح پر ایم کام کا بھی کورس اردو میڈیم سے چلایا جا رہا ہے۔ ایم کام میں سیٹوں کی تعداد 40 ہے جس میں داخلہ میرٹ کی بنیاد پر دیے جائیں گے۔ درخواست فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ 30 جون مقرر ہے۔ (اعتماد۔ حیدرآباد)

## متھلا یونی ورسٹی کے آٹھ کالجوں میں اردو کی پڑھائی کا نظم کیا جائے۔ پروفیسر طیب صدیقی

پٹنہ (24 اپریل)۔ بہار کی دوسری سرکاری زبان اردو کے فروغ و تشہیر کے لیے حکومت بہار بے حد سنجیدہ اور فعال ہے۔ اردو حلقے کی بحالی، اردو اساتذہ کی بحالی، سیمینار، کانفرنس، مشاعرے وغیرہ کا انعقاد سرکاری سطح پر ہوتا ہے۔ یہ فروغ اردو کی سمت ایک اچھی اور مثبت کاوش ہے، لیکن ان سطحی طریقہ کار سے اوپر اٹھ کر بنیادی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ آج بہت سارے اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی تعلیم بند ہے جو افسوس ناک اور لمحہ فکریہ ہے۔ یہ باتیں للت نارائن متھلا یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں اپنی خدمات انجام دے چکے پروفیسر طیب صدیقی نے ایک پریس ریلیز میں کہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ للت نارائن متھلا یونی ورسٹی کے آٹھ کالجوں میں اردو کی پڑھائی نہیں ہو رہی ہے جو بے حد افسوس ناک ہے۔ شہر کے تین کالج سی ایم سائنس کالج، مارواڑی کالج اور مہارانی کلیانی کالج میں 60 فیصد سے زائد مسلم طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں پھر بھی وہاں اردو کی تعلیم نہیں ہو رہی ہے۔ میں نے 1977 سے 1988 کے درمیان اپنی کوشش سے طلبہ کے لیے بغیر فیس کے مارواڑی کالج اور مہارانی کالج میں اردو کی تعلیم کا نظم کرایا تھا لیکن ابھی تعلیم بند ہے۔ 12 اگست 1984 کو جب میں سنڈیکیٹ کا ممبر منتخب ہوا تھا، اردو کے موضوع کو زور و شور سے اٹھایا تھا۔ اردو ڈپارٹمنٹ میں مولانا آزاد چیئر اور ہندی ڈپارٹمنٹ میں ودیاپتی چیئر شروع کرانے کے لیے وائس چانسلر سے یقین دہانی کرائی تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ آج دونوں چیئر بخوبی کام کر رہے ہیں۔ اسے اور آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر طیب صدیقی نے کہا کہ حکومت اردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہے۔ وہ سرکاری طور پر بہار کے سبھی اضلاع میں فروغ اردو سیمینار، مشاعرہ وغیرہ کا انعقاد کراتی ہے یہ اچھی بات ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم اور اچھی بات یہ ہے کہ سرکار اردو کی تعلیم کو سبھی اسکولوں اور کالجوں میں یقینی بنائے تاکہ بنیادی سطح پر اردو مضبوط ہو سکے۔ نتیش کمار کی حکومت نے اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سے کام کیے ہیں، ان سے میرا مطالبہ ہے کہ وہ اردو زبان کی حفاظت اور اس کے فروغ کے لیے اردو کی تدریس کو تمام اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں لازمی قرار دیں تاکہ گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا کو فروغ دینے والی اردو زبان کی ترقی ہو سکے۔ اس کے لکھنے، پڑھنے اور بولنے والوں میں اضافہ ہو سکے۔ حکومت کی اردو زبان کے تئیں سنجیدگی اس بات سے بخوبی ظاہر ہے کہ وہ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام آن لائن اردو لرننگ کورس چلا رہی ہے، جس میں مختلف شعبہ ہائے حیات میں کام کرنے والے غیر اردو داں اعلیٰ افسران، ڈاکٹرس، انجینئرس، وکلا، صحافی، طلبا اور اساتذہ بھی اردو سیکھ رہے ہیں۔ یہ حکومت کا اردو کے تئیں ایک بہت ہی مثبت اور پسندیدہ عمل ہے۔ حکومت اسی سوچ کو آگے بڑھاتے ہوئے اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی تدریس کا آغاز کرے اور اسے لازمی قرار دے۔

(قومی تنظیم۔ پٹنہ)

## بدل گئی مدھیہ پردیش میں پولیس کی قانونی ڈکشنری

### 675 قانونی الفاظ کو کیا گیا تبدیل، اردو، فارسی اور انگریزی کی جگہ ہوگا ہندی کا استعمال

بھوپال (14 مئی)۔ مدھیہ پردیش میں اب پولیس کو پرانے الفاظ چھوڑ کر نئی اصطلاحات کے مطابق الفاظ کا استعمال کرنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر پولیس کو اب یہ نہیں کہنا ہوگا کہ وہ غیر حاضر تھا، بلکہ پولیس کو یہ کہنا ہوگا کہ وہ انوپستھت تھا۔ اسی طرح 'قتل' کو 'ہتیا' کہا جائے گا اور 'جانچ پڑتال' کی جگہ 'انوسندھان' کہا جائے گا۔ مدھیہ پردیش حکومت نے پولیس کی قانونی ڈکشنری میں یہ تبدیلی کی ہے۔ اب جب بھی پولیس کسی معاملے کی 'جانچ' کرے گی تو اسے کہنا ہوگا کہ وہ 'انوسندھان' کر رہی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی جرم 'سنگین' ہے تو اسے سنگین کہنے کے بجائے 'گمبھیر' کہنا ہوگا۔ اگر معاملہ 'تحقیقات' کا ہے تو اسے اب 'جانچ' کہنا ہوگا۔ اس طرح کی کئی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ مدھیہ پردیش میں پولیس ڈکشنری میں کل 675 الفاظ ایسے ہیں جنھیں تبدیل کیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ قانونی زبان میں ایسے بہت سے الفاظ تھے جو فارسی، اردو یا انگریزی سے لیے گئے تھے۔ اب ان تمام الفاظ کو ہٹا کر ان کی جگہ ہندی زبان کے الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ تقریباً 675 ایسے الفاظ ہیں جنھیں قانونی زبان میں جگہ دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ یہ الفاظ کسی نہ کسی طرح عام لوگوں کی زبان سے جڑے ہوئے ہیں۔ مدھیہ پردیش پولیس کی ڈکشنری میں کچھ نئے الفاظ شامل کیے گئے ہیں۔ بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو اب نہیں بولے جائیں گے۔ ان الفاظ پر لگام لگائی جارہی ہے۔ (راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

## اسسٹنٹ ٹیچر کی بھرتی کی کارروائی شروع

پریاگ راج (16 مئی)۔ اسسٹنٹ ٹیچر بھرتی کی کارروائی شروع ہوگئی ہے۔ اس سلسلے میں 12460 اساتذہ کو آن لائن اسکول الاٹ کرنے سے پہلے مانو سمپدا پورٹل پر اسکول، رجسٹرڈ طلبہ و طالبات اور اساتذہ کی تفصیل اپڈیٹ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ سکریٹری بیسک ایجوکیشن کونسل سریندر کمار تیواری نے سبھی بی ایس اے کو خط بھیج کر 30 مئی تک تفصیل اپڈیٹ کرنے کے لیے کہا ہے۔ پورٹل پر تفصیل اپڈیٹ کرنے والے نکات کے سلسلے میں تفصیل سے جانکاری بی ایس اے کو خط میں دی گئی ہے۔ سکریٹری نے کہا کہ بند اسکول، سنگل اسکول، دیہی و شہری علاقوں میں اسکولوں کی تعداد اور انسٹرکٹرز کی تعداد لازمی طور پر متعینہ وقت میں مانو سمپدا پورٹل پر اپڈیٹ کیا جانا ضروری ہے۔ 30 مئی تک جن اضلاع میں پورٹل پر تفصیل اپڈیٹ نہیں کی جائے گی ان اضلاع میں منتخب ٹیچروں کو اسکول الاٹ نہیں کیا جاسکے گا جس کے لیے متعلقہ ضلع کے بی ایس اے ذمہ دار مانے جائیں گے۔ سکریٹری نے اس کام کو اہم بتاتے ہوئے تفصیل اپڈیٹ کرتے وقت مستعد رہنے کا حکم دیا ہے تاکہ اسکول الاٹ کرنے کے بعد کسی طرح کی گڑبڑی سامنے نہ آئے۔ انھوں نے کہا ہے کہ دیہی و شہری علاقوں کے اسکولوں کا اندراج صحیح سے کیا جائے۔ دھیان رکھا جائے کہ اسکول میں اب تک داخلہ لینے والے طلبہ و طالبات کی صحیح تعداد درج کرنے کے ساتھ تعینات اسسٹنٹ ٹیچر، ہیڈ ماسٹر، شکشا مترا اور انسٹرکٹروں کی تعداد درج کرنے میں کسی طرح کی گڑبڑی نہ ہونے پائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تفصیل اپڈیٹ نہ ہونے کی وجہ سے آن لائن اسکول الاٹمنٹ کی کارروائی میں دشواری پیش آتی ہے، ساتھ ہی تاخیر بھی ہوتی ہے۔ کارروائی شروع ہونے کے بعد اگر اس بات سے واقف کرایا جاتا ہے کہ مانو سمپدا پورٹل پر اپڈیٹ نہیں کیا گیا ہے تو اسے لاپرواہی تسلیم کیا جائے گا۔ (انقلاب۔ دہلی)

## رفتید ولے نہ از دل ما

### سلام بن رزاق

ممبئی۔ اردو کے مشہور و ممتاز افسانہ نگار سلام بن رزاق کا طویل علالت کے بعد 7 مئی 2024 کو نوی ممبئی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 83 برس تھی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی اور ایک بیٹا شامل ہیں۔ ان کی تدفین بعد نماز مغرب بیٹے قبرستان مرین لائنز میں عمل میں آئی۔ بڑی تعداد میں محبان اردو نے انھیں نم آنکھوں سے سپرد خاک کیا۔ سلام بن رزاق کا تعلق شہر ممبئی سے تھا حالاں کہ ان کا آبائی وطن خطہ کوکن تھا۔ ایک عرصے تک ممبئی میونسپل کارپوریشن کے اسکولوں میں بطور استاد فرائض انجام دیتے رہے۔ سلام بن رزاق افسانہ نگاری میں ہندوستان بھر میں مشہور و مقبول ہوئے۔ ان کی ہندی کے ادبی حلقے میں بھی قدر و منزلت رہی، حالاں کہ وہ شاعری کے ذریعے ادب میں داخل ہوئے تھے۔

سلام بن رزاق نے افسانے کے علاوہ ڈرامے، تنقیدی مضامین، بچوں کا ادب اور ترجمہ نگاری پر بھی خاص توجہ کی ہے۔ پچاس سے زائد افسانے ریڈیو آکاشوانی سے نشر ہوئے۔ ان کے ایک درجن سے زائد افسانوں کو ڈراموں کی شکل میں پیش کیا گیا۔ انھوں نے کئی فلموں اور ٹی وی سیریلوں میں رائٹر اور اسسٹنٹ رائٹر کے طور پر بھی کام کیا۔ آدھا درجن کے قریب رسائل نے ان کے فن پر نمبر اور گوشے نکالے نیز معروف ناقدین ادب نے ان کی فنی ہنرمندیوں کا اعتراف کیا، اسی کے ساتھ ان کی فکر و فن پر چند پی ایچ ڈی اور درجن بھر کے قریب ایم فل کے مقالے بھی لکھے گئے۔ کئی ادبی جلسے ان کے اعزاز میں منعقد ہوئے اور چودہ سے زائد ان کی کہانیاں مختلف سطح کی درسیات میں بطور نصاب شامل ہیں۔ سلام بن رزاق نے ہندی، مراٹھی اور اردو سے معکوس ترجمہ نگاری کی۔ بال بھارتی کی لسانی و نصابی کمیٹی کے اہم رکن رہے۔ ان کی مجموعی بائیس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں چار افسانوی مجموعے 'ننگی دوپہر کا سپاہی'، 'معبر'، 'شکستہ بتوں کے درمیان' اور 'زندگی افسانہ نہیں' قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح کے کلا زنی (بچوں کا ناول)، ناہم کی کہانی (مراٹھی ناول کا ترجمہ)، جی اے کلکرنی کی کہانیاں (مراٹھی سے ترجمہ شدہ کہانیاں) اور 'عصری ہندی کہانیاں' (ہندی سے ترجمہ شدہ کہانیاں) جیسی کتابیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ وہ منصب درس و تدریس سے وابستہ تھے اور سبک دوش ہو کر پہلے بھیونڈی اور پھر نوی ممبئی میں منتقل ہوگئے اور آج وہ اپنی بیٹی کے گھر خالق حقیقی سے جا ملے۔

### علاء الدین عنبر اشرفی

ممبئی۔ اردو کے مشہور شاعر اور ممبئی میونسپل کارپوریشن کے معروف استاد علاء الدین عنبر اشرفی 8 مئی 2024 کو اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے انھیں ناسک کے ایک اسپتال میں داخل کیا گیا تھا، جہاں تقریباً سترہ دنوں تک آپ کا علاج چلتا رہا اور بالآخر 8 مئی 2024 کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ناسک کے جہانگیر قبرستان میں مرحوم کی تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم میں بلا کی خوبیاں تھیں۔ آپ بچوں کے بہت اچھے شاعر، بہت اچھے مقرر، بہت اچھے خوش نویس، ڈراما نویس اور گلوکار تھے۔ مرحوم علاء الدین عنبر ممبئی میونسپل کارپوریشن میں کم و بیش 28 برسوں تک اپنی خدمات انجام دیں اور یکم جولائی 2006 کو نذیر میونسپل اسکول سے سبکدوش ہوگئے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی اور ایک بیٹا شامل ہیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

# نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : جنھیں میں نے دیکھا، جنھیں میں نے جانا
مصنفہ : ڈاکٹر شمع افروز زیدی
ضخامت : 296 صفحات
قیمت : 350 روپے
ملنے کا پتہ : A7-1، رحمان اسٹریٹ، مرادی روڈ، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی-110025
تبصرہ نگار : ام ماریہ حق

E-mail: ummemariahaque@gmail.com

ڈاکٹر شمع افروز زیدی صاحبہ کی شخصیت دنیائے ادب میں محتاج تعارف نہیں۔ موصوفہ دہلی سے شائع ہونے والے اردو ادب کا مقبول ترین ماہنامہ 'بیسویں صدی' کی ایڈیٹر ہیں۔

اس رسالے کو ملک و بیرون ملک کی سطح پر اہل علم و دانش کے حلقے میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ایسے سخت حالات میں جہاں اردو کے خلاف فرقہ وارانہ بیج بویا جا رہا ہے اور زبان اور مذہب سے جوڑ کر اس کے خلاف سازشیں کی جا رہی ہیں لیکن اس کے باوجود آج بھی ماہنامہ 'بیسویں صدی' کو شائع کرنا قابل تعریف بات ہے۔ میرا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی زندگی اردو کے لیے وقف کر دی۔ آپ جیسی شخصیات کی وجہ سے ہی ایسے برے حالات میں آج بھی اردو زبان کا چراغ روشن ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کی ہمت اور حوصلے کو سلامت رکھے۔ اس کے ساتھ ہی آپ 'اردو ناول میں طنز و مزاح'، 'فن کے آئینے میں' اور 'تنقیدی دریچے' جیسے اہم موضوعات پر مشتمل کتابوں کی مصنفہ بھی ہیں۔ زیر نظر کتاب 'جنھیں میں نے دیکھا، جنھیں میں نے جانا' ان کی چوتھی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں ان کے 33 مضامین اور دو انٹرویوز شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ مضامین ریڈیو اور سیمینار میں پڑھے جا چکے ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ مصنفہ نے خود تحریر کیا ہے جس میں وہ لکھتی ہیں کہ 'جنھیں میں نے دیکھا، جنھیں میں نے جانا' میں جن اکابرین ادب کا ذکر ہے ان سب سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔ چنانچہ ان کے تئیں محاسن کا ذکر کرتے ہوئے جانے انجانے ان کی شخصیت کا پرتو میری تحریروں میں آ گیا ہے۔ میں نے جب اس کام کا آغاز کیا تھا تو میرے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میری یہ کاوش تکمیل کے مراحل سے گزر کر جب منظر عام پر آئے گی تو ان میں سے کتنی ہی ہستیاں ہمارے درمیان سے چلی جائیں گی۔ شمع افروز صاحبہ نے اس کتاب میں کشمیری لال ذاکر، مظفر حنفی، قاضی مشتاق احمد، ظفر گورکھپوری، مناظر عاشق ہرگانوی، آصف زہری، ششیر سنگھ شیر، رونق جمال، رئیس صدیقی اور رحمان وغیرہ جیسی ادبی شخصیات کی علمی خدمات بحسن و خوبی اور ان سے ہوئی ملاقات کا ذکر نہایت خوب صورت انداز میں درج کیا ہے۔ اس مجموعے میں شامل شخصیات کی گراں قدر خدمات، روشن افکار و نظریات اور ان کے رنگ و بو کو ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے سمیٹنے کی بہترین کاوش کی ہے۔ انھوں نے ان مضامین کو مختلف مواقع پر تحریر کیا ہے۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں جن شخصیات کا ذکر ہے ان سے موصوفہ ملاقات کر چکی ہیں جس کے سبب خود شمع افروز صاحبہ کی داخلی شخصیت کے رنگ بھی ان مضامین میں جا بجا نظر آتے ہیں۔

کتاب کا پہلا مضمون 'کشمیری لال ذاکر: عہد ساز شخصیت' میں مصنفہ کی تنقیدی بصیرت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ "ذاکر صاحب کی مقبولیت کا اصل راز ان کی تحریروں میں پنہاں ہے۔ وہ علم و ادب اور فکر و فن کے ایک ایسے دریا کے مانند تھے جو ہمہ وقت زندگی کی روایتی شان سے بہے۔ ان کے اندر دردمندی کا جو وصف تھا وہ بہت کم قلم کاروں کو ہی نصیب تھا۔ وہ اشخاص، نظریات، اعتقادات اور حساسیت پر جب غائر نظر ڈالتے تھے تو ان کی نگاہیں تذبذب و شش و پنج کی اتھاہ گہرائی سب کچھ دیکھ لیتی تھیں۔ اسی لیے واقعات کی دلکشی، ماحول کی جاذبیت، جذبات کی اثر آفرینی نے ان کے ناول '[illegible]' کو ایسی زبان عطا کر دی ہے کہ اسے ہم ذاکر صاحب کا شاہکار ناول قرار دیں تو بے جا نہ ہوگا"۔ اس کتاب کا دوسرا مضمون 'مظفر حنفی: طنز نگار شاعر' میں وہ لکھتی ہیں کہ "پروفیسر مظفر حنفی کا نام نوک زبان پر آتے ہی ایک ایسی شخصیت کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے جو انتہائی فعال اور متحرک ہیں۔ ان کی شخصیت کے مختلف النوع زاویے ہیں۔ وہ ناقد بھی ہیں، مضمون نگار اور افسانہ نگار بھی۔ انھوں نے سفرنامے بھی قلم بند کیے ہیں اور ترتیب، تدوین و تراجم نیز ادب اطفال میں بھی ان کے کارنامے کسی سے پوشیدہ نہیں"۔ وہ آگے لکھتی ہیں کہ "عام طور پر ہمارے ناقدین ادب سچی اور کھری تنقید سے پہلو تہی کرتے ہیں وہ دو اور دو چار کے مسئلے پر ہی اٹکے رہتے ہیں۔ مظفر حنفی ایسے سچے اور کھرے فنکار ہیں کہ سچی بات کہنے سے چوکتے نہیں بلکہ خدا لگتی کہنے پر آ جائیں تو قد آور شخصیت کو بھی قلم کی زد پر رکھ لیتے ہیں"۔ مضمون 'ظفر گورکھپوری: دوہے بچے کا شاعر' میں وہ کچھ یوں رقم طراز ہیں "ظفر گورکھپوری کی غزلوں میں خوب صورت امیجری ہے۔ موضوعات کا تنوع، فکر کی بالیدگی، اسلوب کی دلکشی اور فن کی پختگی سے مزین ظفر کی شاعری کو زندہ شاعری کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ان کے ہاں غزل کا پلڑا بھاری ہے لیکن انھوں نے کچھ نظمیں بھی کہی ہیں۔ تاثر کے اعتبار سے ان کی بعض نظمیں قاری کے دل پر گہرا اور انمٹ نقش ثبت کرتی ہیں"۔ ایسے ہی مضمون 'کیول دھیر: پنجاب کا سپوت' میں وہ تحریر کرتی ہیں کہ "ان کے کئی افسانے ہمارے سماج کی ہو بہو عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ دراصل افسانہ محض زندگی کا عکاس یا آئینہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں انسانی زندگی کے مختلف شیڈس اور سماج میں بسے کردار متحرک نظر آئیں تب ہی افسانہ حقیقی معنوں میں کامیاب افسانہ کہلاتا ہے اور کیول دھیر کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ان کے یہاں زندگی چلتی پھرتی، ہنستی، کھیلتی یہاں تک کہ روتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ ایسی خوبی ہے جس نے بلاشبہ انھیں عصر حاضر کا کامیاب فن کار بنا دیا ہے"۔ مضمون 'مناظر عاشق ہرگانوی کے افسانے' میں وہ لکھتی ہیں کہ "مناظر عاشق ایسے ہمہ جہت فن کار ہیں جنھوں نے مختلف میدان میں قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ ناول، سفرنامہ، شاعری، تنقید، بچوں کا ادب، ترجمہ، صحافت غرض جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اسے سنجیدگی کے ساتھ نبھایا۔ اس کتاب کا 29واں مضمون 'رونق جمال کی مختصر کہانیاں' میں مصنفہ نے افسانچے پر اپنی رائے کو کچھ یوں تحریر کیا ہے: "افسانے، طویل افسانے، مختصر افسانے لکھے جاتے گئے۔ یہ تمام تبدیلیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس صنف میں طبع آزمائی کرنے والوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو افسانہ مختلف مراحل طے کرتا ہوا افسانچے کی منزل میں داخل ہو گیا۔ افسانچے کی صنف میں جن لوگوں نے اپنی پہچان قائم کی ہے ان میں ایک نام رونق جمال کا بھی ہے"۔ کتاب کے آخر میں انھوں نے پاکستان کے شاعر منیر نیازی سے ان کے گھر میں دل چسپ ملاقات اور انٹرویو میں شامل گفتگو سے منیر نیازی کی زندگی اور ان کے ادب کے روشن نقوش پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کے آخر میں م. ناگ صاحب کی مختصر رائے شامل کی گئی ہے۔ بقول م. ناگ "شمع افروز زیدی نے افسانہ نویسی سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا لیکن بہت جلد انھوں نے تنقید جیسی مشکل صنف کو اپنا لیا۔ انھوں نے تنقیدی مضامین لکھے، تخلیق کی بجائے قلم بند کیے۔ تنقید کے شعبے میں خواتین خال خال ہی نظر آتی ہیں لیکن شمع افروز زیدی نے اپنے قدم جما لیے"۔ وہ آگے لکھتے ہیں کہ 'جنھیں میں نے دیکھا، جنھیں میں نے جانا' میں شامل چند مضامین پڑھنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ شمع افروز زیدی عصری ادب پر بھی گہری نگاہ رکھتی ہیں۔ انھوں نے کسی تخلیق کار کو بت بنا کر پیش نہیں کیا اور نہ ہی کسی قسم کا ہوا کھڑا کیا ہے جس طرح سکہ بند ناقد اپنے مضامین میں دیتے ہیں۔ گول مول باتوں کی جگہ دو ٹوک اور سادہ انداز میں تخلیق کاروں کی صلاحیتوں کے بارے میں رائے قائم کی۔ مجھے ان کی تنقید خاص دلچسپ لگی جس کے لیے مصنفہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔

❤❤

## شہر سخن کے سلطان حضرت حشم الرمضان

(پہلی برسی پر)

کتنی جانکاہ جہت ہوئی تیز رفتار اس دور کی
وقت کی سانس چڑھنے لگی سارے عالم میں پھیلی گھٹن

لب پہ قفل، شکستہ بازو، پیروں میں زنجیر
برسوں کے خوابوں کی نکلی کیا انکی تعبیر

مکر و ریا کی اس بستی میں کون سنے اے دل
چاہے وہ انصاف نہ بانٹیں، ہاتھوں میں میزان تو ہے

اب تو پل بھر میں چہرے بدلنے لگے
آدمی پر یقیں آدمی کیا کرے

شاعر، ادیب، صاحب نقد و نظر ملے
دیکھا قریب سے تو سبھی پیشہ ور ملے

جانے کس جنت میں آ پہنچی ہماری زندگی
جس کو بھی دیکھو وہی حوا، نیا آدم لگے

مختصر یہ کہ شہر سخن کے اس سلطان کے یہاں لطف زبان کے ساتھ فنکاری بھی ہے جو براہ راست ہمارے دلوں کو چھو لیتی ہے۔ یہی انداز بیان کسی بھی شاعر کو بلندی عطا کرتا ہے۔ ان کی غزلوں میں جہاں کلاسیکی رچاؤ، زبان کی شگفتگی بتاتی ہے وہیں جذبے کا والہانہ پن انھیں چونکاتا ہے اور ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ ان کی غزلیں تعداد میں زیادہ نہ سہی لیکن معیار کہیں مجروح ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ان کا سرمایۂ سخن قلیل ضرور ہے لیکن گنجینۂ سخن کا حکم رکھتا ہے اور آخر میں انھی کی آرا سے اپنی گفتگو کا اختتام کرتا ہوں:

"میں شاعر ہوں، ایک فری لانس شاعر۔ میں نے کسی ازم کی پابندی نہیں کی۔ تجربے اور مشاہدے کے روپ میں زمانے نے جو کچھ مجھے دیا اور جن باتوں سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا ان کے خد و خال اور قد و قامت کے مطابق جو جوڑے انھیں جچ رہے تھے میں نے انھیں وہی شعری جوڑے عطا کر دیے۔"

عظیم انصاری
C/O- ALI SHAHID DILKASH, 387/1/205, WEST PURAWAS.
NEAR PURSBASHA MASJID E BILAL, DIST NOERTH 24 PGS
PO-KANKINARA, PIN-743126, W.B
E-mail: azimnakhel@gmail.com
MOB-8013853103

## بقیہ: ملک زادہ منظور احمد: ایک بے ریا شخصیت

(صفحہ 2 سے آگے)

بیٹھ جایئے اس کے بعد کوئی سواری نہیں ملے گی۔ شمیم صاحب روپے اٹھا کر پچھلی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں جب گھومتا گھامتا والی صاحب کی دکان پر پہنچا تو شمیم صاحب اپنا قصہ بیان کر رہے تھے کہ اطہر نبی صاحب نے ان کے ساتھ خاصی بدسلوکی کی ہے۔ والی صاحب کا جواب تھا کہ جب اطہر صاحب کوئی پروگرام کرتے ہیں اس دن وہ فرعون بے سامان کی طرح نظر آنے لگتے ہیں۔ میں نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے عرض کیا کہ والی بھائی ساری غلطی شمیم صاحب کی ہے اور میں نے پورا واقعہ دہرایا۔ شمیم صاحب بالکل خاموش ہو گئے۔ والی بھائی نے کچھ کہنا چاہا مگر رک کر مجھ سے بولے کہ شعیب ذرا تین چائے کے لیے آواز دے دیں اور چائے پینے کے درمیان بھی کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس میں نے مشاعروں میں خمار بارہ بنکوی اور ملک زادہ صاحب کو ہمیشہ دیکھا کہ لفافے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لفافہ جیب میں رکھ لیتے تھے کبھی کنوینر کے سامنے لفافہ کھولنا بھی آداب کے خلاف سمجھتے تھے پیسوں کا مطالبہ تو دور کی بات، شاید اس کی بنیادی وجہ یہ رہی ہوگی کہ ملک زادہ صاحب اور خمار بارہ بنکوی جب مشاعروں کی دنیا میں داخل ہوئے تھے تب مشاعروں کا معیار اور انسانی قدریں اپنے عروج پر تھیں۔ مشاعرے کا معیار اور قدریں دھیرے دھیرے زوال پذیر ہوتی رہیں مگر کم سے کم ان دونوں حضرات نے اپنے طور پر اپنی ذات تک ان قدروں کو مٹنے سے بچائے رکھا۔

آج خمار صاحب ہیں اور نہ ہی ملک زادہ صاحب، اللہ دونوں کو غریق رحمت کرے۔ اب دھیرے دھیرے ایسے روشن چہرے دیکھنے کو ہماری آنکھیں ترس جاتی ہیں، ہو سکتا ہے ابھی کچھ لوگ ہوں جو ان قدروں کے امانت دار بھی ہوں مگر ان تک میری رسائی نہیں ہے۔ اب ہم جس مادی دور میں جی رہے ہیں وہاں دوسرا ملک زادہ منظور احمد شاید ہی پیدا ہو سکے۔

ملک زادہ صاحب نے آخر میں ذاتی شرز کے عنوان سے اپنے بارے میں اور مشاعروں کی پوری تاریخ کو قلم بند کر دیا ہے۔ یہ کتاب جہاں ایک طرف ملک زادہ صاحب کے توانا اسلوب کی نمائندگی کرتی ہے وہیں دوسری طرف مشاعروں کی پوری تاریخ بھی ہمارے سامنے لے آتی ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے ہم ان قدروں کی بازیافت بھی کر سکتے ہیں جو کبھی ہمارے مشاعروں کی شان ہوا کرتی تھیں۔ ملک زادہ صاحب نے جہاں ایک طرف اعلیٰ قدروں کو مشاعرے میں پروان چڑھتے ہوئے دیکھا تھا وہیں آخر آخر ان قدروں کو ٹوٹتے بکھرتے بھی دیکھا۔ میری طالب علمی کے زمانے میں پروفیسر ملک زادہ عمر میں خاصے چھوٹے تھے مگر آج لکھنؤ کی فعال ادبی شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا ہے جس پر میں دل ہی دل میں ایک خوشی سی محسوس کرتا ہوں۔

---

ڈاکٹر شعیب نظام

105/591، حافظ علیم کمپاؤنڈ، بھنّاپروا، چمن گنج، کانپور۔ 208001

Mob.8960416841

## بقیہ: دسویں اور بارہویں کلاس کے نتائج کا اعلان، اردو میڈیم اسکولوں کی کارکردگی تسلی بخش

(صفحہ 4 سے آگے)

زینت محل اسکول کا دسویں جماعت کا رزلٹ بھی اس سال صد فیصد آیا۔ مدیحہ پروین نے 92.8 فیصد نمبر لاکر اول مقام حاصل کیا۔ کشش نے 90 فیصد نمبروں کے ساتھ دوسری جب کہ بازیہ نے 88 فیصد نمبروں کے ساتھ تیسری پوزیشن حاصل کی۔

بارہویں بورڈ کے امتحان میں ایس کے وی بلبلی خانہ اسکول کا رزلٹ 97 فیصد رہا۔ 69 طالبات میں سے 66 طالبات نے بورڈ امتحان میں شرکت کی، ان میں سے 64 طالبات نے کامیابی حاصل کی۔ دو طالبات کی کمپارٹمنٹ آئی۔ 91.4 فیصد کے ساتھ ثنا انصاری نے اسکول میں اول مقام حاصل کیا۔ 89.2 فیصد نمبر لاکر حبیبہ فاطمہ نے دوسری جب کہ 85.6 فیصد نمبر حاصل کر کے لائبہ راشد نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اسکول کے مطابق اردو میں طالبات نے مجموعی طور پر 24 ڈسٹنکشن حاصل کیں۔

ایس بی وی نمبر 1، اردو میڈیم جامع مسجد اسکول کا بارہویں جماعت کا رزلٹ اس سال 93 فیصد رہا۔ گزشتہ سال اسکول نے صد فیصد نتائج درج کرائے تھے۔ 65 طلبہ نے بورڈ امتحان میں شرکت کی، ان میں سے چھ طلبہ کی کمپارٹمنٹ آئی ہے۔ یوسف راجپوت نے 86.20 فیصد نمبر حاصل کر کے اسکول میں اول مقام حاصل کیا۔ محمد عارش نے 83 فیصد نمبر لاکر اسکول میں دوسری پوزیشن حاصل کی جب کہ محمد حمید نے 82.40 فیصد نمبر حاصل کر کے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اسکول کا دسویں جماعت کا رزلٹ 92 فیصد رہا۔ 71 طلبہ نے بورڈ امتحان میں شرکت کی تھی جس میں سے 65 طلبہ نے کامیابی حاصل کی جب کہ 6 طلبہ کی کمپارٹمنٹ آئی ہے۔ 95.4 فیصد نمبروں کے ساتھ سید محمد عالم نے پورے اسکول میں اول پوزیشن حاصل کی۔ دوسرے نمبر پر محمد سالم نے 92 فیصد نمبر حاصل کیے اور عمیر علی نے 88 فیصد نمبر کے ساتھ تیسری پوزیشن حاصل کی۔

اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول کا بارہویں جماعت کا نتیجہ اس بار 87.8 فیصد رہا۔ سائنس، کامرس اور آرٹس کے تینوں زمروں میں کل 230 طلبہ و طالبات بورڈ کے امتحانات میں شریک ہوئے تھے۔ کامرس اسٹریم کے طالب علم محمد کیف اقبال نے 89 فیصد نمبرات کے ساتھ اسکول میں اول پوزیشن حاصل کی ہے۔ 88.80 فیصد مارکس کے ساتھ دوم پوزیشن پر کامرس اسٹریم کے ہی محمد انس رحمٰن نے اپنا قبضہ جمایا ہے۔ تیسرا مقام آرٹس اسٹریم کے محمد معاذ فاروقی کو ملا ہے اور انھیں 88.60 فیصد نمبرات حاصل ہوئے ہیں۔ اسکول کے پرنسپل اور منیجر نے کہا کہ بارہویں جماعت کے طالب علموں کی اس بہترین کامیابی اور ان کے علمی سفر کو پُر وقار ڈھنگ سے مزید آگے بڑھانے میں بلاشبہ اساتذہ کا اہم کردار رہا ہے۔

شفیق میموریل سینئر سیکنڈری اسکول کا بارہویں جماعت کا رزلٹ اس سال 96.77 فیصد رہا۔ سائنس اسٹریم کا رزلٹ صد فیصد، کامرس اسٹریم کا رزلٹ صد فیصد جب کہ آرٹس اسٹریم کا رزلٹ 94.31 فیصد رہا۔ اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر زاہد خاں نے بتایا کہ دسویں جماعت کے بورڈ امتحان میں اس سال 46 طلبہ نے شرکت کی تھی، ان میں سے 36 طلبہ نے کامیابی حاصل کی ہے۔ اسکول کا مجموعی رزلٹ 78.26 فیصد رہا۔ دس طلبہ کی کمپارٹمنٹ آئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بارہویں جماعت میں ہندی، اردو، ریاضی، تاریخ، کمپیوٹر آرٹس، اکنامکس، اکاؤنٹنسی، بزنس اسٹڈیز، فزکس، کیمسٹری اور بایولوجی کا رزلٹ صد فیصد رہا۔ دسویں جماعت میں ریاضی، ہندی، اردو اور سوشل سائنس کا رزلٹ صد فیصد رہا۔ (انقلاب۔ دہلی)

☆☆☆

## انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

| | | |
|---|---|---|
| کلیات اظہارت شلی | ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی | 400/- |
| آزادی کے بعد دہلی میں غزل کا تنقیدی مطالعہ | ڈاکٹر بشیر بدر | 500/- |
| دو ادب (مشفق خواجہ) | محمد صابر | 500/- |
| انور عظیم کی ادبی کائنات | ایقان الحق | 700/- |
| ہجوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں) | غلام حمید | 2400/- |
| تحقیق و تدوین | ڈاکٹر زیش | 250/- |
| تحقیقی مباحث | رؤف پاریکھ | 300/- |
| علم سفر یا تھا کیں | شائق دیوکول | 200/- |
| عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے چند اہم پہلو | افتخار عالم خاں | 350/- |
| قدرت کا بلا (موسم کا بدلاؤ) | سید ضیا وحید | 600/- |
| کتابیات حالی | ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد | 300/- |
| یہ عشق کا بے محابا | ڈاکٹر بلال فرید | 300/- |
| جب دیوں نے سر اٹھے | ڈاکٹر بلال فرید | 360/- |
| سیر المنازل (مرزا سنگین بیگ) | شریف حسین قاسمی | 600/- |
| خواب تنہا | قطرت انصاری | 200/- |
| مکتوبات مولوی عبدالحق بنام مشاہیر | میر حسین علی امام | |
| | یاسمین سلطانہ فاروقی | 700/- |
| قطعہ (کلیات زبیر انگاہ) | زبیر انگاہ | 500/- |
| In This Live Desolation (Autobiography of Akhtarul Iman) | ترجمہ: بیدار بخت | 500/- |
| حسن افتخار (کلیات افتخار عارف) | افتخار عارف | 1500/- |
| گواہی (شاعری) | گوہر رضا | 500/- |
| میری زمین کی دھوپ (ہندی) | ملو وکاروتہ پاچھی بشر | 400/- |
| کشف و بیدرد | ڈاکٹر زیش | 250/- |
| ٹیپو سلطان کا خواب (گریش کرناڈ) | محبوب الرحمان فاروقی | 300/- |
| اپنی دنیا آپ پیدا کر | غلام حیدر | 500/- |
| وقائع بابر | ظہیر الدین محمد بابر | 1000/- |
| In This Poem Explanations of Many Modern Urdu Poems (انگریزی) | بیدار بخت | 600/- |
| میری زمین کی دھوپ | ملو وکاروتہ پاچھی بشر | 600/- |
| اردو شاعرات اور نسائی شعور | ڈاکٹر ناظر حسین | 330/- |
| مجھے اک بات کہنی ہے | شاہد کمال | 400/- |
| انتخاب غالب | امتیاز علی عرشی | 600/- |
| باغ گل سرخ | افتخار عارف | 300/- |
| رفتگاں کا سراغ | سرور الہدیٰ | 450/- |
| کلیات مصطفیٰ زیدی | سرور الہدیٰ | 900/- |
| اسے ذہن وطن اور دیگر مضامین | ڈاکٹر زیش | 225/- |
| ارمغان علی گڑھ | پروفیسر عتیق احمد صدیقی | 400/- |
| تیرتھ آنند روحی | معین الدین عقیل | 100/- |
| مجموعہ سلام مچھلی شہری | بیدار بخت | 700/- |
| کستوری کنڈل بسے | ڈاکٹر زیش | 250/- |
| اپنی ادبی (ہیئتی) کے نام گاندھی جی کے محبت نامے | اعجاز ملک | 250/- |
| سرمایہ کلام | حبیب الرحمان | 500/- |
| متی کا قرض | ڈاکٹر زیش | 300/- |
| راس مسعود | حکیم سید ظل الرحمان | 350/- |
| کلکتہ میں اردو کے ادارے | معین الدین عقیل | 300/- |
| کراچی میں اردو غزل اور نظم | پروفیسر شاہد کمال | 300/- |
| متن بر متن | سرور الہدیٰ | 300/- |
| مہابھارت | ڈاکٹر زیش | 200/- |
| دور فرنگ شاعر | وفا صدیقی | 180/- |
| میرتقی میر حیات اور شاعری | پروفیسر خواجہ احمد فاروقی | 500/- |
| گوشہ چند قمر رئیس | علی احمد فاطمی | 300/- |

# حسرت موہانی کی قلندرانہ زندگی

**معصوم مرادآبادی**

سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کی پیدائش یکم جنوری 1875 کو یوپی کے ضلع اناؤ کے قصبہ موہان میں ہوئی۔ ان کا اصل نام سید فضل الحسن اور تخلص حسرت موہانی تھا۔ وہ سرسید کے قائم کردہ ایم اے او کالج کے ابتدائی اور ہونہار طالب علم تھے۔ ایک عظیم مجاہد آزادی کے طور پر ان کی شناخت سب سے بلند ہے۔ 1921 میں انھوں نے ہی 'انقلاب زندہ باد' کا وہ نعرہ دیا تھا جو آج بھی پوری دنیا میں حریت پسندوں کو سب سے محبوب نعرہ ہے۔ وہ آئین ساز اسمبلی کے رکن تھے۔ خاص بات یہ ہے کہ صحیح العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود شری کرشن کے معتقد بھی تھے۔ حسرت موہانی نے قلندرانہ زندگی بسر کی اور اپنی ادا کے گہرے نقوش چھوڑے۔ افسوس کہ ملک کی جدوجہد آزادی کے بہت سے رہنماؤں کی طرح ہم نے انھیں بھی فراموش کردیا ہے۔

حسرت موہانی ایک بلند پایہ شاعر، ایک بے باک صحافی، مفکر اور محقق سب ہی کچھ تھے۔ انھیں ایک ناکام سیاست داں کے طور پر بھی جانا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے اپنی زندگی میں مختلف اور متضاد نظریات رکھنے والی سیاسی جماعتوں سے وابستگی اختیار کی۔ وہ کانگریس، مسلم لیگ، کمیونسٹ پارٹی اور جمعیۃ علمائے ہند جیسی جماعتوں سے وابستہ رہے۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ وہ تقسیم وطن کے مخالف تھے۔ اردو شاعری میں انھیں غزل کے ایک بڑے شاعر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان کی ایک عشقیہ غزل کو شہرت دوام حاصل ہوئی، جس کا ایک شعر یوں ہے:

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

حسرت موہانی اودھ کی تہذیب و معاشرت میں پلے بڑھے ایک دیہاتی نستعلیق انسان تھے۔ وہ لکھنؤ کے ہی ایک قصبہ موہان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اظہر حسین اگرچہ ایک جاگیردار تھے لیکن حسرت کی

> حسرت موہانی نے اپنی صحافت کے ذریعے اس دور کے مسلمانوں کا مذاق درست کرنے اور ان میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی اور 'اردوئے معلی' کے ذریعے ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کیا۔

طبیعت 'یک طرفہ تماشا' سے کم نہیں تھی۔ ان کا بچپن ننھیال میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم گھر میں ہی حاصل کرنے کے بعد مڈل اسکول کے امتحان میں سارے صوبے میں اول آئے اور وظیفے کے حقدار بنے۔ پھر انٹرنس کا امتحان فتح پور سے پاس کرکے علی گڑھ روانہ ہوگئے، جہاں ان کی زندگی یکسر بدل گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اودھ کی تہذیب کے پروردہ حسرت جب علی گڑھ میں وارد ہوئے تو کچھ اس طرح کہ ایک ہاتھ میں پاندان تھا، بدن پر تنگ انگرکھا اور پیروں میں قدیم طرز کے جوتے۔ پہنچتے ہی انھیں علی گڑھ کے لونڈوں نے 'خالہ اماں' کے خطاب سے نوازا۔ یہاں تک کہ سجاد حیدر یلدرم نے ان پر 'مرزا پھویا' کے عنوان سے ایک نظم لکھ ڈالی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے وہ جلد ہی علی گڑھ کے ادبی حلقوں میں مقبول ہوگئے۔ اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے علی گڑھ سے نکالے بھی گئے لیکن اپنے موقف پر اٹل رہے۔

مولانا حسرت موہانی نے بی اے کے امتحان سے فارغ ہوتے ہی علی گڑھ سے 'اردوئے معلی' کے نام سے ایک ماہنامہ کا ڈکلیریشن داخل کردیا۔ مشن روڈ پر ایک کرایے کا مکان لے کر حسرت اپنے رسالے کی تیاری میں مشغول ہوگئے۔ 'اردوئے معلی' کا پہلا شمارہ جولائی 1903 میں منظر عام پر آیا۔ حسرت موہانی کو علی گڑھ کالج کی انجمن اردوئے معلی کے سکریٹری کی حیثیت سے قومی مسائل اور ادبی موضوعات پر غور و فکر کرنے اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے پر قدرت حاصل ہوچکی تھی۔ ان کے مضامین اور شعری نگارشات اس عہد کے ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ اپنے ان تمام تجربات سے ماہنامہ 'اردوئے معلی' کی ترتیب و اشاعت میں حسرت نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ان کے سامنے 'تہذیب الاخلاق' (علی گڑھ)، 'دلگداز' (لکھنؤ)، 'عصر جدید' (میرٹھ) اور 'مخزن' (لاہور) جیسے رسالوں کے نمونے تھے، لیکن اعلا ادبی معیار کے باوجود ان میں سے کسی کو بھی [illegible] کہ حسرت موہانی جیسا حق پسند، بے باک، سرفروش اور آزادی کے جذبے سے سرشار اڈیٹر نصیب نہیں ہوا کیونکہ اس دور میں اکثر مدیران اپنے رسالوں میں سیاسی موضوعات پر مضامین کی اشاعت کو مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے۔ حسرت نے اپنی صحافت کے ذریعے اس دور کے مسلمانوں کا مذاق درست کرنے اور ان میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی اور 'اردوئے معلی' کے ذریعے ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کیا۔

حسرت موہانی ایک انتہائی سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے باوجود انھوں نے ہمیشہ ٹرین کے تھرڈ کلاس ڈبے میں سفر کیا اور بحیثیت ممبر پارلیمنٹ ملنے والی سہولتوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ اکثر رکشے پر بیٹھ کر پارلیمنٹ پہنچتے تھے۔ وہ دہلی میں اخبار 'وحدت' یا ایک مسجد کے حجرے میں قیام کرتے۔ انھوں نے دستور ساز اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے 75 روپے یومیہ لینے سے انکار کردیا تھا اور اس پر احتجاج کیا تھا کہ ممبروں کے لیے دی گئی بڑی رقم یومیہ بھتہ لینا ہندوستان کے غریب اور فاقہ کش عوام کے ساتھ بڑا ظلم ہے۔ راولپنڈی کے ایک مشاعرے میں ایک بار انھیں پانچ سو روپے کا جو نذرانہ ملا تھا، وہ انھوں نے ایک مقامی یتیم خانے کو عطیہ کردیا تھا۔ اسی طرح لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے ایک پروگرام میں شرکت کے لیے انھیں جو نذرانہ پیش کیا گیا تھا، اسے انھوں نے یہ کہہ کر واپس کردیا کہ باقی رقم وہ کیا کریں گے۔ ریڈیو والوں کے بے حد اصرار پر انھوں نے اس میں سے صرف تین آنے لینا منظور کیا۔ ایسی قلندرانہ زندگی گزارنے والے اس عظیم انسان نے 13 مئی 1951 کو لکھنؤ میں وفات پائی اور وہیں کی خاک کا پیوند بھی ہوئے۔

جہاں میں سوگ ہے، ماتم بپا ہے مرگ حسرت کا
وہ وضع پارسا اس کی، وہ شوق پاکباز اس کا

---

**معصوم مرادآبادی**
Z-103 تاج انکلیو، دہلی-110031
E-mail: masoom.moradabadi@gmail.com

مدیر : **اطہر فاروقی**
Editor : Ather Farouqui
شریک مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2095، روڈگران، لال کنواں، دہلی-6
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ پانچ روپے، سالانہ 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org
Phones: 0091-11-23237722



Printed and Published by *Abdul Bari* on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002 and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006. Editor: *Dr Ather Farouqui*